دردِ بیکراں
اسما قادری

دردِ بیکراں

اسما قادری

اس کے ہونٹوں پر بہت مدھم لیکن بے حد خوب صورت مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی اور وہ اتنا خوب صورت، پُرسکون اور اسمارٹ لگ رہا تھا کہ پچھلے تیس سالوں میں شاید ہی کبھی لگا ہو یا شاید بات یہ تھی کہ میرے اندر کے حسد نے کبھی مجھے یہ سب محسوس کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا سچ تھا کہ میں خود سے صرف گیارہ ماہ چھوٹے بھائی سے بے حد حسد محسوس کرتا تھا اور اس حسد کے لیے میرے پاس خاصی

معقول وجوہات بھی تھیں۔ یہ وجوہات ایسی تھیں کہ خون کی کشش پر حاوی ہوگئی تھیں لیکن میں ہمیشہ کا بزدل اور کمزور انسان کبھی کھل کر اس حسد اور نفرت کا اظہار بھی نہیں کرسکا تھا جو شعور کی آنکھ کھلنے سے قبل ہی اس کی پیدائش سے بھی پہلے میرے دل میں جگہ پا چکے تھے۔

جی ہاں، یہ ایک حیرت انگیز بات تھی کہ میں اپنے بھائی کے دنیا میں آنے سے قبل ہی صرف چھ ماہ کی عمر میں اس سے حسد کرنے لگا تھا۔ یہ اور بات کہ میرے دل میں جنم لینے والے اس جذبے کا مجھے یا کسی دوسرے شخص کو اس وقت ادراک بھی نہیں ہوسکا تھا۔ میں نے خود بھی اس سے اپنی نفرت وحسد کے آغاز کا تعین کئی سال بعد کیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہے اور میں نے وقت کا ٹھیک، ٹھیک تعین کیا ہے۔ کیا آپ اس بچے کی کیفیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں جسے صرف چھ ماہ کی عمر میں ماں کے دودھ سے محروم ہونا پڑا ہو اور اس کا سبب تھا میرا چھوٹا بھائی اقبال احمد۔ بغیر کسی وقفے کے میرے فوراً بعد ماں کی کوکھ میں آکر اس نے میرے پہلے بنیادی حق پر ڈاکا مارا تھا۔ اس وقت کی اپنی کیفیات مجھے خود تو یاد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن مختلف قریبی رشتے داروں کی زبانی میں نے جو حالات سنے ان کے مطابق ان دنوں میں بے حد چڑچڑا اور بدمزاج ہوگیا تھا۔ ڈبے کے دودھ کو قبول کرنا میرے لیے بہت مشکل ثابت ہوا تھا اور جب بھوک کی عفریت نے مجھے کبھی ماں کے دودھ کا نعم البدل نہ بننے والی مصنوعی غذا کو قبول کرنے پر مجبور کردیا تھا تو میرے پیٹ نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا۔۔۔۔ آئے دن ہونے والے الٹی موشن نے میری صحت کو خراب کرنے کے ساتھ، ساتھ میرے چڑچڑے پن میں بھی اضافہ کردیا تھا۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ ہنستا بچہ سب کا اور روتا بچہ صرف ماں کا ہوتا ہے چنانچہ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ گھر میں دادی، چچا اور پھپیوں کے ہونے کے باوجود میں کسی کی آنکھ کا تارا نہ بن سکا تھا کہ سب ہی میرے رونے سے گھبرا کر جلد مجھ سے دستبردار ہوجاتے تھے اور بالآخر میں اس ماں کے گلے پڑ جاتا جو بہت قلیل عرصے میں دوسری بار تخلیق کے مرحلے سے گزرنے کی وجہ سے خود بھی کمزور اور بیمار رہنے لگی تھی۔ لازمی بات ہے کہ امی کو مجھ سے محبت تو تھی لیکن گھریلو امور کی انجام دہی اور اپنے کمزور جسم نے خود انہیں بھی قدرے چڑچڑا کردیا تھا ایسے میں جب میں بھی انہیں تنگ کرتا تو ان کی یہ جھلاہٹ عروج پر پہنچ جاتی۔ امی نے خود ایک بار میرے سامنے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ انہوں نے مجھے پہلا تھپڑ صرف نو ماہ کی عمر میں لگایا تھا کیونکہ میں نے متواتر دو راتیں رو، رو کر انہیں جگانے کے بعد اتنا ادھ موا کردیا تھا کہ ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں شل ہوگئی تھیں اور جھلاہٹ میں وہ یہ بھی فراموش کر بیٹھی تھیں کہ صرف نو ماہ کا بچہ اس قسم کے رویّے کا حق دار نہیں ہوسکتا۔ امی کے مطابق مجھے وہ تھپڑ مارنے کے بعد خود بھی دکھ سے بہت دیر تک روتی رہی تھیں لیکن کمان سے نکلا تیر لوٹایا تو نہیں جاسکتا۔ یقیناً یادداشت کی سلیٹ پر نہ ابھرنے کے باوجود وہ تھپڑ میرے اندر کہیں بہت گہرائی میں جاکر نقش ہوگیا ہوگا اور میری نفسیات پر اپنے اثرات مرتب کرتا رہا ہوگا۔ میرے گیارہ ماہ بعد دنیا میں وارد ہونے والے اقبال احمد کو اس قسم کے مسائل کا قطعی سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ بقول میری بڑی پھپو کے وہ پیدائشی خوش مزاج بچہ تھا جسے سب ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ پیدائش کے وقت وہ تھوڑا کمزور ضرور تھا لیکن چھ سات ماہ بعد اس کی صحت بن گئی تو وہ اور بھی پیارا لگنے لگا۔ اس کے مقابلے میں، میں وہی روتا بسورتا بچہ تھا جو عام طور پر صحت کے مسائل میں گھرا رہتا تھا۔

اقبال اس اعتبار سے بھی خوش نصیب ثابت ہوا کہ اسے پورے دو سال تک ماں کا صحت بخش دودھ میسر آیا کیونکہ اس میں اور اس کے بعد پیدا ہونے والی ہماری چھوٹی بہن سمیرا میں پورے تین سال کا وقفہ تھا۔ شاید ایک دشوار تجربے کے بعد میرے والدین نے عقل

مندی سے کام لیا تھا۔ وجہ جو بھی تھی لیکن نتیجہ یہ تھا کہ اقبال مجھ سے گیارہ ماہ چھوٹا ہونے کے باوجود بہت جلد پہلے میرے برابر کا اور بعد میں مجھ سے بڑا لگنے لگا۔ ہماری جسمانی صحت کو دیکھتے ہوئے ہی امی' ابو نے فیصلہ کیا کہ مجھے اور اسے ایک ساتھ ہی اسکول میں داخل کروایا جائے۔ یوں عمر کے اعتبار سے میں اسکول میں اس سے ایک سال آگے ہونے کا حق دار ہوتے ہوئے بھی اس کا ہم جماعت ہی رہا اور یہ زیادتی بھی میرے ساتھ عمر کے اس حصے میں کی گئی جب میں اپنے حقوق کے لیے بولنا تو دور کی بات ان کا صحیح شعور بھی نہیں رکھتا تھا۔ اسکول میں بھی مجھے کم وبیش گھر جیسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ ٹیچرز برملا اس بات پر حیرت کا اظہار کرتیں کہ ہم دونوں سگے بھائی ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہیں۔ میں نہ تو اقبال جیسا خوب صورت وصحت مند تھا اور نہ ہی خوش مزاج وذہین چنانچہ ہوا یوں کہ اس نے سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور میں اوسط درجے کے طالب علم کی حیثیت سے غیر نمایاں ہی رہا۔ مجھ جیسے عام سے طالب علم کی طرف ٹیچرز کی توجہ جاتی تھی بھی تو صرف اس وقت جب کسی ٹیسٹ میں میرے نمبرز خراب آتے تھے۔ اس وقت مجھے اقبال کے شاندار نمبرز دکھاتے ہوئے اس بات پر شرم دلائی جاتی تھی کہ وہ چھوٹا ہوتے ہوئے بھی پڑھائی میں مجھ سے بہتر بلکہ بہت بہتر ہے۔ جی ہاں اقبال کا چھوٹا ہونا بھی میرے لیے ایک طعنہ تھا۔ جب ساتھی طالب علم ہم دونوں بھائیوں کو ایک ساتھ دیکھ کر یہ تبصرہ کرتے کہ اقبال چھوٹا ہونے کے باوجود مجھ سے بڑا لگتا ہے تو مجھے عجیب سا احساسِ کمتری محسوس ہوتا۔ اصل میں ابتدائی عمر میں ہی گھیر لینے والی بیماریوں نے بچپن کے کئی سال گزر جانے کے باوجود بھی مجھے پوری طرح اپنے شکنجے سے نہیں نکلنے دیا تھا اور اس کا اثر میری حاضری، تعلیمی کارکردگی اور قدوقامت سب پر نمایاں تھا۔ یہاں میں ایک بات ضرور بتاؤں گا ہر شخص کے رویّے کے برعکس اقبال کا رویّہ میرے ساتھ بہت محبت بھرا ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے اور چھوٹی بہن سمیرا دونوں ہی سے بہت محبت کرتا تھا البتہ اپنی کم گوئی کے سبب میں سمیرا سے بھی محبت کرنے کے باوجود کبھی اظہار نہیں کرپاتا تھا۔ سو وہ بھی میری نسبت اقبال سے زیادہ قریب تھی اور ہر دم اس کے آگے پیچھے گھومتی رہتی اور بہت سی خواہشوں کی طرح میرے دل میں یہ خواہش بھی تھی کہ سمیرا اقبال کی طرح میرے ساتھ بھی.... بے تکلف ہو لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ البتہ ایک حیرت انگیز بات ضرور ہوگئی اور وہ یہ کہ میں اقبال سے تعلیمی میدان میں ایک سال آگے نکل گیا لیکن نہیں اب کے یقیناً میں کچھ غلط بتا گیا ہوں۔ اصل بات یہ تھی کہ اقبال تعلیمی میدان میں مجھ سے ایک سال پیچھے رہ گیا تھا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ نہم جماعت کے امتحانات سے دو دن قبل اس کے پیٹ میں اتنا شدید اور عجیب وغریب درد شروع ہوا کہ وہ امتحان ہی نہیں دے سکا۔ ان دنوں امی اور ابو دونوں ہی بہت پریشان رہتے تھے۔ چند ہی دنوں میں انہوں نے اقبال کو بہت سے ڈاکٹرز کو دکھا ڈالا اور اس کے بے شمار ٹیسٹ بھی ہوئے لیکن کسی طرح اس کی بیماری کی وجہ نہ پکڑی جاسکی اور پھر اچانک شروع ہونے والا یہ عجیب و غریب درد خود ہی اچانک ختم ہوگیا لیکن اس وقت تک امتحانات ختم ہوچکے تھے۔ اسکول کی پرنسپل اور ٹیچرز نے مشورہ دیا کہ ابھی اقبال صرف بعد میں ہونے والے پریکٹیکل ایگزامز دے دے اور تھیوری کے پرچے اگلے سال میٹرک کے پرچوں کے ساتھ دے دے تو اس کا ایک سال ضائع ہونے سے بچایا جاسکتا ہے۔ سب کو یقین تھا کہ اقبال اتنا ذہین ہے کہ ایسا کرسکتا ہے لیکن خود اقبال نے اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس کے مطابق اکھٹے دو سال کے پرچے دینے سے اس پر بردن پڑے گا اور نتیجہ اچھا نہیں آئے گا۔ اس کا کہنا غلط بھی نہیں تھا۔ اس لیے سب کو اس کی بات ماننی پڑی اور یوں اسکول کا آخری سال اقبال سے الگ جماعت میں

بیٹھ کر میں نے قدرے سکون سے گزارا۔ اس کا میرے رزلٹ پر بھی اچھا اثر پڑا اور میں نے میٹرک کا امتحان اکہتر فی صد نمبرز لے کر یعنی اے گریڈ سے پاس کرلیا۔

میرے اس نتیجے نے قدرتی طور پر گھر والوں کو خوش کیا اور رشتے داروں میں مٹھائی کی تقسیم کے علاوہ مجھے تحائف سے بھی نواز کر ڈھیروں خوشی منائی گئی۔ کالج میں قدم رکھ کر بھی میں دنوں پہلی بار ملنے والی اس اہمیت پر مسرور رہا لیکن کچھ عرصے بعد آنے والے اقبال کے نہم کے نتیجے نے سب دھندلا دیا۔ اس کا اٹھاسی فی صد نمبروں کے ساتھ اے ون گریڈ بن رہا تھا اور میٹرک میں یہ نتیجہ بانوے فی صد نمبرز اور بورڈ میں پانچویں پوزیشن تک جا پہنچا تھا۔ اس کی ایسی شاندار کامیابی کے ہر طرف ڈنکے بج گئے۔ امی، ابو اور سمیرا کے تو لگتا تھا خوشی سے زمین پر قدم ہی نہ ٹک رہے ہوں۔ اقبال کی اتنی نمایاں کامیابی کے اعزاز میں ابو نے شایانِ شان خوشی منانے کا فیصلہ کیا اور تمام عزیز و اقارب کو جمع کرکے ایک شاندار پارٹی کر ڈالی۔ اس موقع پر اقبال کو اتنا سراہا گیا اور اتنے تحائف سے نوازا گیا کہ اپنے میٹرک کے نتیجے سے حاصل ہونے والی خوشی میرے دل میں کملا سی گئی اور میں مہینوں یہ سوچ کر کڑھتا رہا کہ کچھ بھی کرلوں اقبال سے جیت نہیں سکتا، وہ میرے لیے قطعی ناقابلِ شکست تھا۔ جی ہاں میں اس سے ایک ایسا مقابلہ کررہا تھا جس کی اسے خبر ہی نہیں تھی اور اس بے خبری میں ہی اس نے خود کو ملنے والے بہت سے تحائف میں مجھے بھی حصے دار بنالیا تھا۔ اس کے مطابق کئی چیزیں اسے ڈبل ملی تھیں اس لیے اگر وہ ان چیزوں کو میرے ساتھ شیئر کرلیتا تو کوئی حرج نہیں تھا لیکن بات یہیں تک نہیں تھی۔ اس نے تو میری آنکھوں میں پسندیدگی کی جھلک دیکھ کر بڑے ماموں کا دیا ہوا ویڈیو گیم بھی یہ کہہ کر میرے حوالے کردیا تھا کہ اسے اس میں دلچسپی نہیں ہے۔ بعد میں، میں نے سنا تھا سمیرا اسے اس کی حماقت کا احساس دلا رہی تھی لیکن اس نے یہ کہہ کر بات ختم کردی تھی کہ یہ ہم دونوں بھائیوں کا آپس کا معاملہ ہے چنانچہ اسے اس میں نہیں بولنا چاہیے۔ اس کے جواب کا سمیرا نے برا بھی مانا تھا لیکن اپنی شخصیت کے جادو سے کام لے کر اس نے جلد ہی اسے منالیا تھا اور وہ دونوں پھر پہلے ہی کی طرح ہوگئے تھے۔ ان دنوں میں اس کی سخاوت اور دریا دلی کو سراہنے کے بجائے اس بات پر جلتا کڑھتا رہتا تھا کہ ایک جیسا رشتہ ہونے کے باوجود میرے اور سمیرا کے درمیان وہ تعلق نہیں ہے جو اُن دونوں کے درمیان ہے۔

اسی طرح کے جذبات و کیفیات کے درمیان ڈولتے لڑکپن کا وہ دور بھی گزر گیا اور ایک سال کے فرق سے ہم دونوں بھائی یونیورسٹی جا پہنچے۔ میں نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن اس لیے لیا تھا کہ میری اوسط درجے کی کامیابی مجھے کسی پروفیشنل کالج تک نہیں پہنچا سکتی تھی لیکن اقبال کا میرٹ بننے کے باوجود میڈیکل میں ایڈمیشن نہ لینا سب کے لیے حیرت کا سبب بن گیا۔ اس نے جینیٹکس میں ایم ایس سی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

''نہیں بھئی، میں ڈاکٹر نہیں بننا چاہتا کیونکہ میرا دل اتنا مضبوط نہیں ہے کہ میں لوگوں کو تکلیف میں دیکھ سکوں اور ویسے بھی ضروری نہیں کہ ہر اچھا طالب علم ڈاکٹر یا انجینئر بنے۔ میں ٹیچنگ لائن میں جانا چاہتا ہوں۔ ہمارا المیہ ہے کہ لوگ ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس شعبے میں قدم رکھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ٹیچنگ نالائق اور ناکام لوگوں کا شعبہ بن گیا ہے حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ سب سے زیادہ لائق اور قابل لوگ اس شعبے میں بھرتی کیے جائیں کیونکہ ان ہی لوگوں نے تو مستقبل کے معماروں کی نوک پلک سنوارنی ہے۔'' لوگوں کی حیرت کا جواب اس نے اس تقریر سے دیا تھا۔

''ہونہہ، خواہ مخواہ خود کو منفرد ثابت کرنے کی کوشش۔'' یہ میرا اس پر دل میں کیا جانے والا تبصرہ

تھا۔ بہرحال وہ تو ہر طرح کے تبصروں اور تجزیوں سے بے نیاز اپنی دُھن میں مگن رہنے والا بندہ تھا چنانچہ آرام سے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا۔ یہ ان کی کلاسز کے آغاز کا پہلا دن تھا۔ ہم دونوں بھائی ایک ساتھ ہی یونیورسٹی آئے تھے لیکن یہاں آتے ہی وہ اپنے دوستوں کے ہجوم میں گم ہوگیا تھا۔ ہم وقت سے تھوڑا پہلے آئے تھے اس لیے کلاسز کے آغاز میں کچھ دیر تھی۔ میں جو گھر کی طرح باہر بھی زیادہ گھلتا ملتا نہیں تھا تنہا ایک بینچ پر بیٹھ گیا اور یونہی پچھلے دن کے نوٹس پڑھنے لگا۔

''ایکسکیوز می۔'' نسوانی جلترنگ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ اپنی آواز ہی کی طرح گنگناتی غزل...کی سی لڑکی تھی۔ سرو قامت، دودھ میں شہد گھلی سی سنہری رنگت، بڑی بڑی بولتی آنکھیں اور شانوں سے ذرا نیچے آتے ایک سنہری کیچر میں جکڑے آدھے کھلے آدھے قید بالکل سیدھے ریشم کے سے ملائم چمکیلے سیاہ بال۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

''پلیز کیا آپ مجھے جینیٹکس ڈپارٹمنٹ تک گائڈ کردیں گے؟'' مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے بڑے نرم لہجے میں استدعا کی۔

''جی کیوں نہیں۔'' میں فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''آج پہلا دن ہے ناں! اتفاق سے میری کسی فرینڈ نے میرے ساتھ یہاں ایڈمیشن نہیں لیا اور اکیلے ڈپارٹمنٹ کی تلاش میں مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ سنا ہے فرسٹ ڈے اسٹوڈنٹس کو خوب بے وقوف بنایا جاتا ہے اس لیے کسی سے بھی کچھ پوچھنے سے پہلے اچھی طرح دیکھ بھال لینا چاہیے۔'' میرے ساتھ سائنس فیکلٹی کی طرف جاتے ہوئے اس نے بڑی معصومیت سے بتایا۔

''اچھا تو آپ نے خوب دیکھ بھال کر میرا انتخاب کیا ہے؟'' شوخ مزاج نہ ہونے کے باوجود میں اس پل شوخی پر اتر آیا۔ جانے ایسی کیا بات تھی اس میں کہ میں نے خود بخود ہی اپنے دل میں ایک ترنگ سی محسوس کی تھی۔

''جی آپ مجھے خاصے سنجیدہ اور معقول شخص لگے تھے۔'' اس نے اپنی اسی معصومیت اور نغمگی لیے ہوئے سادہ سے لہجے میں جواب دیا جس نے مجھے اولین پل میں ہی تسخیر کرلیا تھا۔

''انشاء اللہ آپ کا یہ انتخاب غلط ثابت نہیں ہوگا۔'' سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے اسے جواب دیا اور پھر مزید گفتگو جاری رکھنے کے خیال سے اسے بتانے لگا۔ ''میرے چھوٹے بھائی اقبال احمد نے بھی اسی شعبے میں ایڈمیشن لیا ہے۔''

''اچھا تو آپ کے بھائی کا نام اقبال احمد ہے اور آپ کا؟'' اس کی سوالیہ نظریں میری طرف اٹھیں۔ ان سیاہ آنکھوں میں اتنی گہرائی تھی کہ میں پوری طرح ڈوب گیا۔

''جمال احمد، میں بی بی اے کا اسٹوڈنٹ ہوں۔'' دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے اسے بتایا۔

''اور میں نوین طاہر۔'' اس کی طرح اس کا نام بھی خوب صورت تھا۔ ''لگتا ہے آپ دونوں بھائی مختلف مزاج کے ہیں اس لیے اتنی الگ الگ فیلڈ کا انتخاب کیا ہے۔'' وہ خاصی باتونی لڑکی تھی اور سچ یہ ہے کہ پہلی بار مجھے کسی کا اس قدر باتیں کرنا اتنا اچھا لگ رہا تھا۔

''درست اندازہ لگایا آپ نے۔'' میں نے اختصار سے اس کی بات کا جواب دیا۔ پہلی ہی ملاقات میں اسے تفصیل سے کیا بتاتا کہ میں بی بی اے صرف ابو کو خوش کرنے کے لیے کررہا ہوں کہ آنے والے وقت میں ان کے ساتھ ان کا بزنس سنبھال سکوں۔ اقبال نے البتہ بہت لاڈلا بیٹا ہونے کے باوجود اس انداز میں نہیں سوچا تھا اور اپنی الگ ہی راہ منتخب کرلی تھی۔ شاید وہ پہلے ہی سب کو اتنا پیارا

تھا کہ اسے کسی کی نظروں میں اپنی اہمیت بنانے کے لیے ایسی کسی جدوجہد کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کے فیصلے پر امی نے ہی معمولی سا اعتراض کیا تھا۔

"تمہیں ڈاکٹر نہیں بننا تو نہ سہی ایم بی اے کرلو تاکہ آگے چل کر اپنے ابو کا ہاتھ بٹا سکو۔" انہوں نے اس کے جینیٹکس میں ایڈمیشن لینے کا سن کر کہا تھا۔ اصل میں پہلے ابو کا چچا کے ساتھ مشترکہ کاروبار تھا۔ خاندانی کاروبار ہی سمجھ لیں لیکن چچا کی شادی کے بعد بدلتے ہوئے حالات کو محسوس کر کے دونوں بھائیوں نے فیصلہ کیا کہ گھر اور کاروبار الگ کرلیے جائیں تاکہ باہمی مروت قائم رہے۔ دادی کا اس وقت تک انتقال ہوچکا تھا اور پھپیاں بیاہ کر اپنے گھروں کو چلی گئی تھیں اس لیے اس فیصلے پر آسانی سے عمل درآمد ہوگیا۔ اکیلے کاروبار کو سنبھالنے اور بڑھانے کے لیے ابو کو دن رات بہت محنت کرنی پڑی تھی سو فطری طور پر امی کی خواہش تھی کہ ہم بھائی ان کا یہ بوجھ بانٹ لیں۔

"پلیز شاہین تم اسے کنفیوز مت کرو۔ یہ میرا خواب دیکھنے والا بہت حساس بیٹا ہے۔ اسے وہ سب کرنے دو جو اس کا دل چاہتا ہے۔ ابھی میں اتنا بوڑھا نہیں ہوا ہوں کہ اکیلا کاروبار کو نہ دیکھ سکوں اور پھر چند سال ہی کی تو بات ہے اپنا جمال تعلیم مکمل کرکے مجھے جوائن کرلے گا۔" ابو نے امی کے اعتراض کو مسترد کردیا تھا اور میں ان کے میٹھے لہجے میں اپنا جمال کہنے پر ہی خوش ہوگیا تھا۔

"آپ کہاں کھوگئے......وہ دیکھیں وہاں کوئی ہاتھ ہلا کر آپ کو اپنی طرف بلا رہا ہے۔" نوین کی آواز نے مجھے خیالات سے نکالا تو میں نے اس کی بتائی ہوئی سمت میں دیکھا۔ وہ اقبال ہی تھا جو مجھے اپنی طرف متوجہ کررہا تھا۔ میں نوین کو لیے اس کی سمت بڑھ گیا اور ان دونوں کو آپس میں متعارف کروایا۔

"نو پرابلم مس نوین، آپ میرے ساتھ آئیں۔ میرا بھی آج یہاں پہلا دن ہے لیکن میرے یہاں اتنے دوست ہیں کہ کسی مشکل میں پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" اس نے اپنے ازلی اعتماد سے نوین سے کہا اور اس دن کے بعد سے ہماری دوستی کی تکون کا آغاز ہوگیا۔ میں موقع ملنے پر تقریباً روز ہی ان کے ڈپارٹمنٹ کا چکر لگالیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ دونوں بھی آجاتے تھے۔ بعض اوقات نوین تنہا ہوتی تھی کہ اقبال کے اتنے دوست تھے کہ اس کے لیے ہر وقت نوین کو کمپنی دینا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ میں اور نوین کبھی کبھی ساتھ لائبریری اور کیفے ٹیریا بھی چلے جاتے تھے باتیں تو وہی زیادہ کرتی تھی اور میں مسکراتا ہوا اسے سنتا رہتا تھا۔ اسے دیکھنا اور سننا مجھے بہت اچھا لگتا تھا پھر وہ ایسی تھی کہ مجھے بھی کچھ نہ کچھ بولنے پر مجبور کرہی دیتی تھی۔ وہ میری زندگی کے بہترین دن تھے۔ میں بہت خوش رہنے لگا تھا اور پڑھائی میں بھی پہلے سے زیادہ جان مارنے لگا تھا۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ آہستہ، آہستہ وہ اقبال کی ذہانت سے متاثر ہورہی ہے۔ ہماری ملاقاتوں میں اب اقبال کا ذکر زیادہ ہونے لگا تھا۔ وہ کیسے پوری کلاس میں سب سے نمایاں ہے، کس طرح اپنے پروفیسرز کو لاجواب کردیتا ہے، نصابی کے ساتھ ساتھ کون، کون سی غیر نصابی سرگرمیوں میں اپنا سکہ جما چکا ہے سب مجھے نوین کی زبانی سننے کے لیے ملتا رہتا تھا۔ میرے لیے یہ کوئی نئی یا غیر معمولی باتیں نہیں تھی لیکن نوین کی زبان پر اس کا اس قدر ذکر مجھے کھلنے لگا تھا۔ اکثر میں بہانے سے موضوع تبدیل کردیتا تھا اور وہ اتنی سادہ تھی کہ میرے اندر کی کیفیت کو سمجھے بغیر دوسرے موضوع میں مگن ہوجاتی۔

ان دنوں میں بہت الجھا، الجھا رہنے لگا تھا۔ کبھی اندازہ لگانے کی کوشش کرتا کہ اقبال کی ذہانت سے متاثر نوین کے دل میں اس کے لیے کوئی جذبہ تو نہیں پنپ رہا ہے جب کوئی حتمی فیصلہ نہ کرپاتا تو

اقبال کا جائزہ لینے لگتا۔ وہ ہمیشہ کی طرح تھا۔ شوخ، متحرک اور دوستوں میں گم رہنے والا۔ اس کے اندر مجھے ایسی ...کوئی علامت نظر نہیں آئی تھی کہ مبتلائے عشق محسوس ہو۔ خدشات میں گھرے میرے دل کے باوجود وقت بہرحال آگے بڑھتا رہا اور میں فائنل ائیر میں پہنچ گیا۔ فائنل کے ایگزامز سے پہلے مجھے احساس ہوا کہ اس کے بعد میرا روز، روز نوین سے ملنا ممکن نہیں ہوگا اور یہ سوچتے ہی مجھے اپنی سانسیں رکتی محسوس ہوئیں۔ زندگی میں پہلی بار ہمت سے کام لے کر میں نے امی کو اپنی پسند سے آگاہ کردیا۔ امی میری زبان سے ایسی بات سن کر حیران ہوئیں اور ہنس کر بولیں۔

"حیرت ہے، میں تو سمجھی تھی کہ یونیورسٹی پہنچ کر اقبال ایسا کوئی گل کھلائے گا۔ اپنے اتنے سنجیدہ بیٹے سے تو مجھے ایسی کوئی امید ہی نہیں تھی۔"

"کس بات کی امید نہیں تھی والدہ ماجدہ؟"

اسی وقت اقبال وہاں آٹپکا اور دھم سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے امی سے پوچھا۔

"جمال کی بات کررہی ہوں۔ موصوف یونیورسٹی میں کسی لڑکی کو پسند کر بیٹھے ہیں اور مجھ سے اس کے گھر رشتہ لے جانے کو کہہ رہے ہیں۔" امی نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو مجھے کم ازکم اتنا اطمینان ہوگیا کہ انہیں میری خواہش گراں نہیں گزری ہے۔

"واؤ زبردست، کون ہے وہ خوش نصیب؟"

امی کی اطلاع پر وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

"کسی نوین طاہر کا نام لے رہا ہے۔ تمہاری کلاس فیلو ہے ناں......تم بتاؤ کیسی لڑکی ہے؟" امی نے جواب دیا جبکہ میں خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ مجھے لگا کہ امی کا جواب سن کر اس کے چہرے پر لمحے بھر کو سایہ سا لہرایا ہو لیکن بس ایک پل کی بات تھی، وہ دوبارہ اپنے شوخ موڈ میں واپس آگیا۔

"واہ امی، کیا زبردست انتخاب کیا ہے آپ کے بیٹے نے......یقین کریں ایسی بہو پاکر تو آپ خوشی سے پھولے نہیں سمائیں گی۔" اس نے اپنا ووٹ میرے حق میں ڈال دیا۔

"اب تو اس لڑکی کے گھر جانا ہی پڑے گا۔ میرے دونوں بیٹے جس کی اتنی تعریف کررہے ہیں وہ کوئی عام لڑکی تو ہونے سے رہی۔ بتاؤ کب لے کر چل

ناممکن

چلی جاتی ہے آئے دن وہ بیوٹی پارلر
کہ مقصد ہے جواں لگنا، مثالِ حور ہوجانا
مگر یہ بات کسی خاتون کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی
کہ ممکن ہی نہیں کشمش کا پھر انگور ہوجانا

مرسلہ: رُدابہ علی، لالہ موسیٰ

حسرتیں

یوں اکیلے میں مجھے اہلِ وفا یاد آئے
جیسے بندے کو مصیبت میں خدا یاد آئے

جیسے اجڑے ہوئے پنچھی کو نشیمن اپنا
جیسے اپنوں کے بچھڑنے پہ دعا یاد آئے

جیسے ڈھلتی ہوئی شاموں کو سویرا کوئی
جیسے پنجرے میں پرندے کو فضا یاد آئے

جیسے بوڑھے کو خیالات میں بچپن اپنا
جیسے بچے کو شرارت پہ سزا یاد آئے

جیسے اجڑی ہوئی بستی کو زمانہ اپنا
جیسے طوفاں کے ٹھہرنے میں دیا یاد آئے

جیسے پلکوں کے جھپکتے ہی کنارے بھیگیں
جیسے اس روز ہُوا کون جدا یاد آئے

جیسے سورج کی تمازت میں گھٹا یاد آئے
یوں اکیلے میں مجھے اہلِ وفا یاد آئے

مرسلہ: نفیسہ آرا، راس الخیمہ

رہے ہو مجھے اس کے گھر؟'' امی کو بھی جوش آگیا۔

''میرے خیال میں ابھی تھوڑا ٹھہر جائیں امی۔ ایگزامز ہونے دیں پھر بات چھیڑیئے گا۔'' اس بار اس نے سنجیدگی سے امی کو مشورہ دیا۔

''وہ کیوں بھئی؟'' امی نے وہ سوال کیا جو میرے اپنے دل میں بھی تھا۔

''وہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس طرح کی باتیں بعض اوقات ذہنی انتشار کا بھی سبب بن جاتی ہیں کہیں ڈسٹرب ہو کر نوین کی توجہ پڑھائی سے نہ ہٹ جائے پھر ہمیں اس کے گھر والوں کے ردِعمل کے بارے میں بھی کوئی اندازہ نہیں۔ بعض اوقات لوگ اپنی بیٹیوں کو کو ایجوکیشن میں پڑھنے کی اجازت تو دے دیتے ہیں لیکن یہ پسند نہیں کرتے کہ ان کے لیے ان کے کسی ساتھی کا پروپوزل آئے۔ ایسی صورت میں بھی نوین کا نقصان ہوسکتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے جمال تمہاری کبھی نوین سے اس موضوع پر بات ہوئی ہے؟'' امی کو اپنے اعتراض کے حق میں دلائل دیتے ہوئے اس نے اچانک ہی مجھ سے پوچھا۔

''نہیں، میں نے یونیورسٹی میں کبھی اس سے اس قسم کی گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھا۔'' میں اس کے درمیان میں ٹانگ اڑانے پر بدمزہ تو ضرور ہوا تھا لیکن اس کے دلائل اتنے بے جان نہیں تھے کہ انہیں رد کیا جاسکتا چنانچہ سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے طے ہوگیا کہ ایگزامز کے بعد میں نوین کے گھر تمہارا رشتہ لے کر جاؤں گی۔'' میرا جواب سن کر امی نے حتمی فیصلہ سنا دیا۔ فیصلہ مناسب ہی تھا اس لیے میں بھی مزید اصرار نہیں کرسکا۔ اب امی سے تو یہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ نوین کو ایک دن بھی دیکھے بغیر رہنا میرے لیے سخت دشوار کام ہے۔ امتحانات کا زمانہ بھی بالآخر گزر گیا۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ امی آخری پیپر والے دن ہی نوین کے گھر رشتہ لے کر جا پہنچیں لیکن اقبال نے انہیں روک دیا کہ آج کل نوین کے گھر والے کسی قریبی رشتے دار کی شادی میں مصروف ہیں اس لیے ایک آدھ ہفتے بعد ان سے رجوع کیا جائے۔ میں اس تاخیر پر خاصا جزبز ہوا اور تھوڑا سا بدگمان بھی کہ کہیں اقبال کی نیت تو خراب نہیں ہے اور وہ میرے نوین سے رشتے میں رکاوٹ تو نہیں ڈالنا چاہتا لیکن پھر جلد ہی یہ سارے خدشات اور بدگمانی بھی دور ہوگئی۔ میرا رشتہ نوین کے لیے گیا اور روایتی مراحل سے گزرنے کے بعد فوراً ہی قبول بھی کرلیا گیا۔ میری خواہش پر امی نے شادی کے لیے قریبی تاریخ لے لی تھی۔ تاریخ لیتے ہی ہمارے گھر میں گویا ہنگامے جاگ اٹھے۔ امی اور سمیرا پورے جوش و خروش سے تیاریوں میں جت گئیں۔ اقبال ان کا ڈرائیور بنا ہر جگہ ان کے ساتھ رہتا۔ شادی کارڈ چھپوانے سے لے کر کیٹرنگ تک کے سارے انتظامات اس نے سنبھال رکھے تھے اور مشکل سے ہی گھر میں دکھائی دیتا تھا۔

''آپ سارا دن کہاں مارے، مارے پھرتے رہتے ہیں اقبال بھائی۔ تھوڑا اپنی صحت کا بھی خیال کیجیے۔ تھوڑے سے دنوں میں اچھے خاصے دبلے ہوگئے ہیں آپ۔ ایسی بھی کیا مصروفیت کہ آپ کو ڈھنگ سے کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں ہے۔'' ایک دن سمیرا اس پر خفا ہو رہی تھی تو آنے والے خوش کن دنوں کے خیالات میں مگن مجھے احساس ہوا کہ واقعی وہ کچھ کمزور ہوگیا ہے۔

''کوئی دُبلا وبلا نہیں ہوا تھوڑا سا اسمارٹ ہوگیا ہوں۔ تم اماؤں والی عینک لگا کر مجھے نہیں دیکھا کرو۔ یہ اماؤں کی ہی عادت ہوتی ہے کہ انہیں اپنی بچے ہمیشہ کمزور نظر آتے ہیں۔'' اس نے ہنس کر سمیرا کو ٹال دیا اور پھر میری طرف متوجہ ہوا۔

''شاپنگ کے لیے چلیں! تمہارے لیے اچھی سی شیروانی پسند کرتے ہیں۔'' مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ ہم دونوں گھر سے روانہ ہوگئے۔ وہ پورا

دن اس نے مجھے شاپنگ سینٹر میں گھماتے ہوئے گزار دیا کہیں کچھ پسند ہی نہیں آرہا تھا اسے۔ بالآخر بڑی مشکل سے ایک شاپ پر وہ یہ سمجھانے میں کامیاب ہوسکا کہ ہم کس طرح کی شیروانی تیار کروانا چاہتے ہیں۔ شاپ کیپر نے اس کے آئیڈیے کو بہت سراہا اور خود بھی چند مشورے دے دیے۔

''میں نے نوین کے ویڈنگ ڈریس کی مناسبت سے تمہاری شیروانی تیار کروائی ہے۔'' آرڈر دے چکنے کے بعد اس نے مجھے بتایا تو میں ہنس دیا۔ ان دنوں میں بہت خوش رہا کرتا تھا۔

''یار یہ نوین کا موبائل دیکھو مستقل بند ہے۔ میں اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ جب سے رشتے کا سلسلہ چلا ہے میری اس سے بات ہی نہیں ہوسکی ہے۔'' موقع دیکھ کر میں نے اس سے ذکر کر ڈالا۔

''بات چیت تو اس کی مجھ سے بھی نہیں ہو رہی ہے۔ اصل میں اس معاملے میں اس کی فیملی کچھ دقیانوسی ہے اور ان کے ہاں لڑکی کا قبل از شادی دولھا یا سسرال والوں سے ربط وضبط پسند نہیں کیا جاتا۔'' اس نے مجھے بتایا تو میں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

''اتنی ٹھنڈی سانسیں کیوں لیتے ہو بھائی ......شادی کا دن کون سا بہت دور ہے۔ وہ تمہاری زندگی میں آجائے تو جی بھر کر اس سے باتیں کرتے رہنا۔'' اس نے مجھے چھیڑنے کے انداز میں کہا تو میں دھیرے سے ہنس کر اس دن کے خیالوں میں کھو گیا جب نوین میری بن کر میری زندگی میں داخل ہوتی۔

شادی کا دن واقعی میری زندگی کا سب سے خوب صورت دن تھا۔ اقبال اور سمیرا کے دوستوں نے مل کر خوب رونق لگا رکھی تھی۔ اس دن پہلی بار مجھے صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ میرے والدین، بھائی، بہن مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ ان محبتوں کی جلو میں جا کر میں اپنی محبت نوین کو بیاہ لایا۔ دلہن بن کر نوین پر بہت روپ آیا تھا۔ خواب گاہ کی تنہائی میں، میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا اور پھر ٹوٹ کر اس پر اپنی محبتوں کی برسات کردی۔ اسے اپنی شدتوں سے آگاہ کرتے مجھے بھرپور احساس تھا کہ وہ حیران سی یہ سب سن رہی ہے۔ حیران تو اسے ہونا ہی تھا کہ یونیورسٹی میں تقریباً روز ملاقات ہونے کے باوجود میں نے کبھی زبان سے اظہار نہیں کیا تھا۔ اظہار کے سارے الفاظ اور انداز تو میں نے آج کی خوب صورت رات کے لیے سنبھال رکھے تھے اور لگتا تھا کہ میری شدتوں کے آگے نڈھال نوین میں بولنے کا یارا بھی نہ رہا ہو۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری محبت کا اظہار تمہیں اتنا حیران کرے گا کہ تم گنگ ہی ہوجاؤ گی۔'' اس کی حالت دیکھ کر میں نے اسے ہنس کر چھیڑا۔

''میں واقعی حیران ہوں کہ مجھے کبھی احساس کیوں نہیں ہوا کہ تم مجھے اتنی شدت سے چاہتے ہو۔'' وہ کھوئے، کھوئے سے انداز میں صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ وہ جو ڈھیروں باتیں کرتی تھی آج اس کی یہ مختصر کلامی مجھے لطف دے رہی تھی۔ اس کا رکا رکا اور جھجکا ہوا سا یہ انداز اسے مزید خوب صورت جو بنا رہا تھا لیکن اگلے چند دنوں میں اس کی یہ کم گوئی مجھے الجھن میں مبتلا کرگئی۔ یوں تو وہ گھر کے تمام افراد کے ساتھ گھل مل گئی تھی اور سب اس سے خوش نظر آتے تھے لیکن اس کے مزاج کی شوخی و چونچالی کہیں گم سی ہوگئی تھی۔ اگرچہ اس کا رویہ میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔ وہ میری ہر خواہش کو حکم کا درجہ دیتی تھی اور پہننے اوڑھنے میں میری پسند کا خاص خیال رکھتی تھی۔ میری تمام ذمے داریاں بھی اس نے ازخود سنبھال لی تھیں پھر بھی میں کوئی کمی سی محسوس کرتا تھا۔ آخر ایک دن میں نے اس سے اس حوالے سے بات کر ڈالی۔

''لڑکیوں کو وقت کے ساتھ تبدیل ہونا پڑتا ہے جمال۔ یونیورسٹی کی بات اور تھی لیکن اب میں

ایک شادی شدہ عورت ہوں جسے گھر کی بڑی بہو کی حیثیت سے اپنی ذمے داریاں نبھانی ہیں۔ اب مجھ پر پہلے کی سی شوخی اور لاابالی پن اچھا نہیں لگے گا۔ ہاں البتہ اگر مجھ سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کہیں کوئی کوتاہی ہوئی ہو تو آپ شکایت کر سکتے ہیں۔''

اس نے ایسے انداز میں مجھ سے یہ بات کہی کہ مجھے قائل ہونا پڑا۔ شکایت تو اس سے کوئی تھی ہی نہیں میں نے اسے یہ پیشکش ضرور کی کہ وہ چاہے تو یونیورسٹی جوائن کر سکتی ہے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس کے مطابق وہ اپنا سارا وقت اپنے گھر کو دینا چاہتی تھی اور واقعی اس نے خود کو گھر میں بہت اچھی طرح مدغم کر لیا تھا۔ اتفاق سے میری شادی کے بعد ابو کی طبیعت کچھ خراب رہنے لگی تھی اور بڑھے ہوئے بلڈ پریشر کی وجہ سے ڈاکٹر نے انہیں آرام کا مشورہ دیا تھا۔ میں چونکہ کاروبار میں ابو کا ہاتھ بٹاتا تھا چنانچہ اس صورتِ حال کی وجہ سے ساری ذمے داری میرے شانوں پر آ گئی اور حسبِ پروگرام میں نوین کے ساتھ ہنی مون پر نہ جا سکا۔ ان حالات میں نوین نے بھی مجھ سے بھرپور تعاون کیا اور پروگرام ملتوی ہو جانے پر برا ماننے کے بجائے الٹا میری دلجوئی کی کہ ہم آئندہ کبھی گھومنے پھرنے جا سکتے ہیں۔ ایک ایسی عورت جو آپ کی محبت ہو اور ہر اعتبار سے تعاون کرنے والی بھی کیسی نعمت ہوتی ہے اس بات کا مجھے نوین کی رفاقت میں بھرپور تجربہ ہوا۔ اپنی زندگی کے اس خوب صورت تجربے اور کاروباری مصروفیات میں مگن مجھے اقبال کے بدلتے معمول کا احساس ہی نہیں ہو سکا۔ ایک رات میں کسی ضرورت کے تحت کمرے سے باہر نکلا تو اقبال کے کمرے کے آگے سے گزرتے ہوئے سمیرا کی آواز پر چونک گیا۔

''کیا ہو گیا ہے آپ کو اقبال بھائی، آپ تو بالکل ہی بدل گئے ہیں۔ رات گئے تک گھر سے باہر رہتے ہیں۔ ڈھنگ سے کھاتے پیتے تک نہیں۔ صحت دیکھی ہے کتنی خراب ہو رہی ہے اور اس پر سے یہ اسموکنگ بھی شروع کر دی ہے۔'' سمیرا کے لہجے میں بیک وقت خفگی اور پریشانی تھی۔

''بیکار میں پریشان ہوتی ہو بہنا۔ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے بس آج کل پڑھائی میں ذرا زیادہ جان مار رہا ہوں فائنل ائیر ہے ناں اس لیے زیادہ محنت کرنی پڑ رہی ہے۔ زیادہ وقت یونیورسٹی میں گزر جاتا ہے اس کے بعد دوست کمبائن اسٹڈی کے لیے گھسیٹ لیتے ہیں۔ پڑھتے، پڑھتے تھک جائیں تو ذرا خود کو فریش کرنے کے لیے گھومنے نکل جاتے ہیں۔ بڑی بے فکری کے دن ہیں بہنا، میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ لائف انجوائے کر رہا ہوں۔ اس کے بعد تو ظاہر ہے پیروں میں بیڑیاں پڑ جائیں گی اور پریکٹیکل لائف کا آغاز ہونے پر یہ ساری بے فکری اور عیاشی خواب ہو جائے گی اس لیے تم مجھے مت روکو اور لائف انجوائے کرنے دو۔'' اقبال نے بے پروا سے انداز میں اسے جواب دیا تو وہ پل بھر کے لیے چپ ہو گئی لیکن پھر جھنجلا کر بولی۔

''چلیں باقی سب تو ٹھیک ہے لیکن یوں چین اسموکنگ کر کے آپ کون سا انجوائے کر رہے ہیں؟'' مجھے اندازہ تھا کہ ان الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ اس نے اقبال سے سگریٹ بھی چھینی ہوگی۔

''یہ تو یاروں کی صحبت کا اثر ہے۔ تمہیں معلوم ہے جب سب لڑکے باہر نکلے ہوں تو اس طرح کا شغل لازمی کرتے ہیں اور جو ساتھ دینے سے انکار کرے اسے عورت ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ میں ایک سگریٹ کی خاطر اپنی مردانگی پر حرف آتا تو نہیں دیکھ سکتا ناں۔'' اس کا انداز ویسا ہی شوخ تھا لیکن مجھے بڑا عجیب سا لگا اور میں یہ سوچتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا کہ کسی دن خود اقبال سے بات کروں گا لیکن کچھ جھجک اور مصروفیت کی وجہ سے نوبت ہی نہ آ سکی۔ اقبال سے میری اتنی زیادہ بے تکلفی نہیں تھی

کہ ہر موضوع پر اس سے کھل کر بات کر سکتا۔ ہمارے درمیان جب بھی بات چیت ہوتی تھی آغاز ہمیشہ وہی کرتا تھا۔ ان ہی دنوں میں نے کاروبار کو وسعت دینے کے لیے ایک آفس لاہور میں بھی قائم کرنے کا فیصلہ کیا یوں میری مصروفیات میں مزید اضافہ ہو گیا۔ لاہور والی برانچ نئی ہونے کی وجہ سے وہاں زیادہ توجہ اور وقت دینے کی ضرورت تھی چنانچہ میرا زیادہ وقت لاہور میں گزرنے لگا۔ میں نے سہولت کے لیے وہاں کرایے پر فلیٹ لے لیا تھا چنانچہ ہر ٹرپ پر نوین کو بھی امی کی اجازت سے اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ زندگی بڑی مگن اور سبک گزر رہی تھی۔ آٹھ مہینے کا عرصہ ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گیا۔ ان ہی دنوں مجھے نوین نے دنیا کی سب سے بڑی خوش خبری سنائی تو میں اسے اپنے ساتھ لیے سرشار سا کراچی لوٹا۔ مجھے یقین تھا کہ دادا، دادی بننے کی خبر سن کر امی اور ابو بھی کھل اٹھیں گے۔ ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی تھا کہ اب امی نوین کے لیے سفر کو مضر قرار دیتے ہوئے اسے میرے ساتھ آنے اور لاہور جانے کی اجازت نہیں دیں گی اور مستقل کراچی میں ہی روک لیں گی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر امی نے ایسی کوئی بات کہی تو میں انکار نہیں کروں گا۔ مجھے خود بھی نوین اور اپنے آنے والے بچے کی سلامتی عزیز تھی۔ خوشی سے معمور دل لیے میں کراچی پہنچا تو یہاں کی صورتِ حال نے مجھے ہکا بکا کر دیا۔ اقبال شدید بیماری کی حالت میں اسپتال میں داخل تھا۔

''اس کے دونوں گردے فیل ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹرز کے مطابق شراب نوشی کی کثرت نے اسے اس حال کو پہنچایا ہے۔'' ابو کی دی اطلاع سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ یہ سب کیسے اور کیونکر ہوا کچھ سمجھ نہیں آتا تھا۔ ابو تو گویا دنوں میں بوڑھے ہو گئے تھے۔ ان کا جوان لائق فائق بیٹا اس حال کو پہنچ گیا تھا تو ان کا یہ حال تو ہونا ہی تھا۔ امی اور سمیرا

لازمی

کیا آپ جانتی ہیں کہ چھتری بارش کو نہیں روکتی لیکن اس کی وجہ سے ہم خاصے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ کچھ تو سہی...... یہ بارش ہمیں تر بتر نہیں کر سکتی۔ اسی طرح ہمیں اعتماد کامیابی نہیں دلاتا لیکن یہ ہمیں وہ قوت دیتا ہے جس کے ذریعے ہم مشکلات کا سامنا کر سکتے ہیں۔ اعتماد اور بھروسے کی چھتری ہر عورت کو اپنے پاس لازمی رکھنی چاہیے۔

از: سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا

کی حالت ان سے بھی زیادہ غیر تھی۔ میں اور نوین ان لوگوں کو کوئی خوش خبری کیا سناتے انہیں سنبھالنے میں لگ گئے۔ عجیب دکھ اور بے یقینی کا عالم تھا بھلا یہ بھی کوئی یقین کرنے کی بات تھی کہ وہ لڑکا جس نے بچپن اور لڑکپن نہایت ذمے داری سے مثبت سرگرمیوں میں گزارا ہو سمجھداری کی عمر میں بری صحبت کا شکار ہو گیا اور اپنی صحت کے ساتھ سب کچھ گنوا بیٹھا۔ وہ بھی اتنے مختصر عرصے میں کہ کسی کو کچھ سمجھنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔

''یہ کیا کر لیا میرے بھائی؟'' میں نوین کے ساتھ اس سے ملنے اسپتال پہنچا تو اس کی حالت دیکھ کر بلک اٹھا۔

''کچھ نہیں...... بس زندگی کا خراج ادا کر رہا ہوں۔ کم ظرفوں کے حصے میں ایسی سزائیں تو آتی ہی ہیں۔'' اس نے اداسی سے جواب دیتے ہوئے ایک نظر نوین پر ڈالی جو ضبط کی کوشش کے باوجود نڈھال نظر آ رہی تھی۔ اس کی بے تحاشا سرخ آنکھوں اور ستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کتنے شدید دکھ سے دوچار ہے۔ دیور بننے سے پہلے اس کا اقبال سے دوستی کا رشتہ تھا اور ظاہر ہے کوئی بھی سچا دوست اپنے دوست کو اس حالت میں دیکھ کر

تڑپ اٹھتا وہ بھی بہت دکھی تھی۔

''کیسی ہو نوین؟'' اقبال نے مسکرا کر اس سے دریافت کیا تو وہ جواب میں کچھ نہ کہہ سکی اور اپنے ہونٹ کاٹتی رہی۔

''تمہیں اس حالت میں دیکھ کر میں خود کو مجرم سمجھ رہا ہوں۔ مجھے کیوں خبر نہیں ہو سکی کہ تم کن راہوں پر چل پڑے ہو؟'' میرے اندر ماتم بپا تھا۔

''تمہیں خبر کیسے ہوتی، میں تو اس دنیا میں تھا جہاں سے بندے کو اپنی بھی خبر نہیں ملتی۔'' اس نے سابقہ انداز میں جواب دیا۔ میرا دل چاہا کہ اس کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑ ڈالوں اور پوچھوں کہ اس نے خود پر اور ہم پر اتنا بڑا ظلم کیوں کیا لیکن وہ اس حال میں ہی نہیں تھا کہ اس سے کسی قسم کی جواب طلبی میں وقت ضائع کیا جاتا۔ ابھی تو سب سے زیادہ ضرورت اس کو بچانے کی جدوجہد کرنے کی تھی۔ میں نے اسپتال میں موجود امی اور سمیرا کو زبردستی گھر بھیجا اور خود ڈاکٹر سے ملنے چل پڑا۔

''مسٹر اقبال کے دونوں گردے کام کرنا چھوڑ چکے ہیں۔ ہم نے ان کے جو ٹیسٹ لیے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شراب کے ساتھ دیگر خطرناک نشہ آور ادویات بھی کثرت سے استعمال کر رہے تھے جن کے باعث بہت کم عرصے میں ان کی یہ حالت ہوگئی ہے۔ اب ان کا واحد علاج گردے کی تبدیلی ہے۔ اگر جلد از جلد انہیں کوئی ڈونر نہیں ملا تو ان کا زندہ بچنا بہت مشکل ہے۔'' ڈاکٹر نے بہت صاف الفاظ میں مجھ پر صورتِ حال واضح کردی۔ میں سن سا دماغ لیے اس کے کمرے سے نکلا۔ حالات بتاتے تھے کہ اقبال نے جان بوجھ کر خود کو تباہ کیا ہے۔ ابھی دو ماہ قبل ہی تو وہ کمبائن اسٹڈی کا بہانا کر کے گھر سے ہاسٹل منتقل ہوا تھا اور میری معلومات کے مطابق اس عرصے میں ایک آدھ بار ہی گھر والوں سے ملنے کے لیے آیا تھا بس فون پر ہی بات کر لیتا تھا۔ میرا تو اس عرصے میں سرے سے اس سے سامنا ہی نہیں ہوا تھا ورنہ شاید میں ان تبدیلیوں کو بھانپ لیتا۔

کچھ نہ سمجھ آنے والی کیفیت میں، میں شکستہ حال سا واپس اس کے کمرے کی طرف لوٹا۔ بند دروازے کو کھولنے کے لیے ناب پر ہاتھ رکھتے اندر سے آتی آوازوں پر میں خود کار انداز میں اپنی جگہ تھم سا گیا۔

''جب سہنے کا حوصلہ نہیں تھا تو خود پر اتنا بڑا ظلم کیوں کیا...... کیوں مجھے اپنی زندگی سے نکال دیا؟'' یہ نوین کی آواز تھی جو بلکتی ہوئی اس سے سوال کر رہی تھی۔

''مجھ میں اپنے بھائی کا دکھ سہنے کا بھی تو حوصلہ نہیں تھا ناں۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر تم اسے نہ ملیں تو وہ ٹوٹ جائے گا اور اس کے ٹوٹنے پر میں خود کیسے سالم رہتا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ مجھے اپنا بھائی اتنا عزیز ہے کہ میں اس کی آنکھوں میں پسندیدگی کی ایک جھلک دیکھ کر بھی اپنی پسندیدہ ترین شے سے دستبردار ہو جاتا تھا۔ میں نے اپنا قیمتی تعلیمی سال اس لیے ضائع کر دیا تھا کہ وہ مجھ سے آگے نکل سکے پھر بھلا میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیسے اختیار ہوتے ہوئے بھی پوری نہ کرتا۔'' اقبال کی آواز دھیمی اور ڈوبی ہوئی ہونے کے باوجود میں نے اس کا ایک، ایک لفظ سنا کہ اس وقت میرا پورا وجود ہی کان بنا ہوا تھا۔

''تم نے اپنے ساتھ مجھ پر... بھی بڑا ظلم کیا اقبال۔ میں اس وقت کتنے بڑے امتحان سے دوچار ہوں تمہیں کیسے بتاؤں ایک بیوی اور جمال کے ہونے والے بچے کی ماں کی حیثیت سے میں ان کی وفادار ہوں لیکن میرے دل کا ایک گوشہ تمہارے لیے بھی تڑپتا ہے۔ تمہیں اس حال میں دیکھ کر مجھ پر جو گزر رہی ہے میں ہی جانتی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ عالمِ دیوانگی میں بال کھولے اپنے کپڑے نوچ کر ننگے پاؤں سڑکوں پر بھاگتی پھروں لیکن حیا

اور وفا کی زنجیریں مجھے باندھے ہوئے ہیں۔ شعلوں میں لپٹے ہونے کے باوجود میں ایک چیخ تک نہیں مار سکتی کہ میرے اور تمہارے خاندانوں کی عزت داؤ پر لگ جائے گی۔'' بولتے ہوئے وہ تسلسل سے رو رہی تھی جبکہ میں باہر کھڑا آندھیوں کی زد میں تھا۔

''مجھے تمہاری قوتِ ضبط کا اندازہ نہ ہوتا تو تمہیں اس امتحان میں ڈالتا ہی کیوں؟ مجھے معلوم ہے کہ میری خواہش اور محبت کا بھرم رکھتے ہوئے تم اس کڑے امتحان سے گزر جاؤ گی۔ میں تمہارے ظرف کا قائل ہوں نوین اور مجھے یقین ہے کہ تم کبھی میرا خود پر سے یقین نہیں توڑو گی۔ تم ہمیشہ جمال کو خوش رکھو گی اور بالکل ویسے ہی اُسے چاہو گی جیسے میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ یقین کرو کہ اگر مجھے بھی تمہارے جیسا ظرف عطا کیا جاتا تو میں کبھی خود کو اس حال تک نہ پہنچاتا لیکن کیا کروں مجھ سے تمہاری جدائی کا روگ سہا ہی نہیں گیا اور اس درد کو مٹانے کی جدوجہد کرتے، کرتے میں خود کو ہی مٹاتا چلا گیا۔ تم میری اس کم ظرفی کے لیے مجھے معاف کر دینا نوین۔ مجھے معلوم ہے کہ میں اس دنیا سے جاتے، جاتے تمہارے لیے بہت بوجھ چھوڑے جا رہا ہوں لیکن میرا یہ مان اپنی جگہ ہے کہ تم میرے بعد بھی مجھ سے کیا وعدہ نبھاؤ گی اور میرے بھائی اور گھر والوں کو وہ محبت دو گی جس کی میں نے تم سے خواہش کی تھی۔'' نوین کے ساتھ ساتھ اب وہ خود بھی رو رہا تھا۔ آنسو تو میری آنکھوں میں بھی تھے۔ میں کمرے میں داخل ہوئے بغیر خاموشی سے وہاں سے ہٹ گیا اور اسپتال کے لان میں جا بیٹھا۔ یہاں ایک بینچ پر بیٹھ کر آنسو بہاتے پوری زندگی میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئی اور مجھے یاد آتا رہا کہ اقبال نے کہاں، کہاں میرے لیے کون، کون سی قربانی دی تھی لیکن اتنی بڑی قربانی...... اتنی بڑی قربانی کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا جبکہ وہ نوین سے اتنی شدید محبت کرتا تھا کہ اس کے پاس اس کے بغیر جینے کا تصور ہی نہیں تھا۔

''میں اقبال کو اپنا گردہ ڈونیٹ کروں گا۔''

بہت دیر رونے کے بعد میں بینچ سے اٹھا تو فیصلہ کر چکا تھا۔ اپنی جان کی قیمت پر بھی اپنے اتنے چاہنے والے بھائی کو بچانے کا عزم دل میں لیے میں اس کے کمرے تک پہنچا تو سب ختم ہو چکا تھا۔ وہ جو ہمیشہ مجھ سے آگے رہا تھا اب بھی فیصلہ کرنے میں سبقت لے جا چکا تھا۔ کسی مرنے والے کا اتنا مطمئن چہرہ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس چہرے کے ساتھ ہی ایک اور چہرہ بھی میری نظروں کے سامنے تھا۔ شدتِ ضبط سے تڑختا لیکن سارے بھید چھپا کر رکھنے والا چہرہ۔ یہ چہرہ میری محبوب بیوی کا تھا۔ اس عورت نے بڑے عجیب انداز میں رسمِ وفا نبھائی تھی۔ اقبال کو چاہا تھا تو اس کی خواہش پر اپنا آپ مٹا ڈالا تھا اور میری بیوی بنی تھی تو ایک پل کے لیے کبھی مجھ سے بے وفائی نہیں کی تھی۔ اس کے اندر ہی اندر بکھرتے وجود کا احساس کر کے میں نے اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ مجھے احساس تھا کہ وہ اس سے کہیں بڑھ کر چاہے جانے کے لائق تھی۔ جتنا اب تک میں اسے چاہتا رہا تھا۔ ماضی میں وہ اقبال سے محبت کرتی رہی تھی اس انکشاف پر بھی میرے دل میں کوئی بدگمانی پیدا نہیں ہوئی تھی کہ شاید یہ بات میری لیے کوئی انکشاف ہی نہیں تھی۔ میرے اندر کہیں یہ احساس موجود تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں لیکن اپنی خود غرض محبت نے مجھے کبوتر کی طرح آنکھیں موند لینے پر مجبور کر دیا لیکن آج ان دونوں نے انجانے میں مجھے جو درسِ محبت پڑھایا تھا وہ مجھے ساری زندگی یاد رہنا تھا۔ اس درس کو لینے کے بعد میرے ظرف میں اتنی وسعت پیدا ہو گئی تھی کہ مجھے یقین تھا کہ آنے والے وقت میں نوین سے دُگنی محبت کر رہا ہوں گا کیونکہ اقبال کے حصے کی محبت بھی مجھے ہی کرنا تھی۔